عرب دنیا پر ایک نظر

تبصرہ نگار : مامون فندی*

کتاب : *Inside the Arab World,*
by Michael Field, Cambridge: Harvard University Press, 1995.

زیرِ نظر کتاب کا مصنف یورپ کا ایک باخبر صحافی ہے۔ یہ کتاب عرب دنیا، اس کے مسائل اور مغرب کے عرب دنیا میں مفادات کے بارے میں ہے۔ عرب دنیا میں مغرب کے تین بنیادی مفادات یعنی تیل، اسرائیل اور اسلامی خطرے، کے موضوعات اس کتاب کی صورت گری میں اہم دکھائی دیتے ہیں۔ کتاب اگرچہ بہترین صحافیانہ تحریر ہے، تاہم دیگر مغربی مصنفوں کی طرح اس کا مصنف بھی عرب دنیا میں رونما ہونے والے ہر واقعے کو، بشمول سیاسی اور سماجی احتجاج، مغربی مفادات کی عینک سے دیکھتا ہے۔ اور اس طرح اسلام کو بطور مذہب اور تہذیب کے اس کے استحکام اور سلامتی کے سوال تک محدود کر دیتا ہے۔ خطے پر دیگر مغربی کتابوں کی طرح فیلڈ بھی یہاں کے باسیوں اور ان کی دلچسپیوں کو پس ماندہ قرار دیتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ کتاب کمزور معلومات پر مشتمل ہے بلکہ دیکھا جائے تو دوسرے امریکی رپورٹروں کی کتابوں کی نسبت اس کتاب میں زیادہ تحقیقی محنت نظر آتی ہے۔ اگر مثالیں پیش کی جائیں تو یہ کتاب جوڈتھ ملر کی ''خدا کے ننانوے نام'' (God has Nintynine Names) بلٹن کی ''ریت کے محل'' (Sand (Castles)، اور تھامس فرائیڈمین کی ''بیروت سے یروشلم تک'' (From Beirut to Jerusalem)، سے زیادہ معلوماتی اور زیادہ متوازن ہے۔

فیلڈ کی کتاب کوئی عالمانہ کتاب نہیں ہے، بلکہ یہ ایک تاریخی طور پر معلوماتی اور صحافتی تحریر ہے ان

---

* Mamoun Fandy, Book Reviews, *Middle East Journal*, Fall 1998, P. 131-133.

(ترجمہ و تلخیص: راشد بخاری)

لوگوں کے لیے جو عرب معاملات میں دلچسپی لیتے ہیں اور کسی بھاری بھرکم علمی کام سے بچتے ہوئے مشرقِ وسطیٰ کے مسائل کی پیچیدگیوں کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ چند ایک حقائق کے سلسلے میں غلطیوں اور غیر ذمہ داری کے ساتھ قائم کی گئی آراء کے استثناء کے ساتھ یہ کتاب عرب دنیا کے حالات کا جائزہ لینے کی ایک کامیاب کوشش ہے۔

کتاب کے پہلے سات ابواب ناخوش عرب دنیا کی بدعنوانی، شکست، خراب حکومت اور معاشی ناکامی کی داستان سناتے ہیں۔ ان ابواب میں بیان کی گئی کہانیاں اور داستانیں دلچسپ ہیں تاہم تجزیہ محدود اور ناقص ہے۔ مصنف نے زبان بھاری بھرکم استعمال کی ہے اور اس کی مثالیں خالصتاً مغربی ہیں۔ بعض جگہ اس کی خود ستائی اور اختصار سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ چیزوں کو مکمل سمجھ نہیں پایا۔ بدّوؤں پر ایک جملے میں مصنف لکھتا ہے ''سعودی عرب کے بدّوؤں نے جو ہر چیز کو اس کے برانڈ نام (brand name) سے پکارنے کے ذریعے انہیں شخصی رنگ دینے کے عادی ہیں ریڈیو کو ''احمد سعید'' کے نام سے پکارنا شروع کر دیا ہے۔ احمد سعید ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ میں مصری ریڈیو اناؤنسر تھا'' (ص ۵۶)۔ فیلڈ جو بات سمجھنے میں ناکام رہا کہ بدّوؤں کے ایسا کرنے کی وجہ ان کی حماقت نہیں بلکہ ان کا طنز ہے۔ احمد سعید ایک اناؤنسر تھا جس نے ۱۹۶۷ء میں عربوں کی شکست کو ان کی فتح قرار دیا تھا۔ چنانچہ جب وہ ریڈیو کو ''احمد سعید'' کہتے ہیں تو وہ درحقیقت حکومتی میڈیا کے ناقابل اعتبار ہونے پر طنز کرتے ہیں۔ فیلڈ اس پہلو کو اس لیے نہ سمجھ سکا کہ وہ عربوں کی اپنی تاریخ سے واقفیت اور ان کی ذہانت کے امکان کا اندازہ کرنے میں ناکام رہا۔ (کہ عرب بھی ذہین، حاضر دماغ اور بذلہ سنج ہو سکتے ہیں!)

> کتاب اگرچہ بہترین صحافیانہ تحریر ہے، تاہم دیگر مغربی مصنفوں کی طرح اس کا مصنف بھی عرب دنیا میں رونما ہونے والے ہر واقعے کو، بشمول سیاسی اور سماجی احتجاج، مغربی مفادات کی عینک سے دیکھتا ہے۔ اور اس طرح اسلام کو بطور مذہب اور تہذیب کے اس کے استحکام اور سلامتی کے سوال تک محدود کر دیتا ہے۔

مصنف کا اپنے بارے میں پرفخر روّیہ اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بار بار عربوں کو خود اپنے

حالات اور اپنے اردگرد کی دنیا سے ناواقف قرار دیتا ہے۔ مثلاً وہ کہتا ہے ''عربوں نے اپنی جہالت کی وجہ سے اپنے بارے میں مغربی ممالک کے رویے کا غلط اور ناقص تصور قائم کر لیا ہے'' (ص ۱۶۵)۔ ''عربوں کی جہالت'' کا حوالہ چار صفحات کے وقفے میں پانچ بار دیا گیا ہے اور عرب ذہن کے بارے میں سٹریو ٹائپ رائے قائم کی گئی ہے۔ صرف دو مثالیں درج ذیل ہیں: ''ساز باز پر یقین رکھنے کی وجہ سے، جہالت کے اضافے کے ساتھ عربوں نے مغرب کی طاقت کے بارے میں مبالغے سے کام لیا ہے'' (ص ۱۶۸)۔ اور ''عربوں کے سازشی تصورات اور مغرب کے بارے میں ان کی جہالت ان کو تباہ کر رہی ہے'' (ص ۱۶۹)۔ مصنف بعد میں عربوں اور ان کے معاشروں کو نسل پرست قرار دیتا ہے اور ان کی نسل پرستی کا باعث یہ حقیقت ہے کہ ''مشرقِ وسطیٰ کے معاشرے صنعتی مغرب کے معاشروں کی نسبت زیادہ تباہ حال ہیں''۔ (ص ۱۰)۔ ''عرب معاشرہ نمائشی معاشرہ ہے'' (ص ۱۲۰)۔ اور پھر وہ اس یقین کا اظہار کرتا ہے کہ مغربی معاشرے اس طرح واضح طور پر نسل پرست نہیں ہیں جس طرح مشرقِ وسطیٰ کے معاشرے۔ ان اور دیگر اقتباسات سے اندازہ ہوتا ہے کہ نسل پرستی مغرب میں بھی زندہ اور موجود ہے۔

کتاب کا بہترین حصہ وہ ہے جہاں تجارت اور معاشیات کے مسائل پر بحث کی گئی ہے۔ جن ابواب میں عرب اقتصادیات کے جمود، ان کے حل کے لیے عالمی مالیاتی فنڈ کی جاری کردہ پالیسیوں اور ان دونوں عوامل کے سماجی اور سیاسی اثرات پر بات کی گئی ہے وہ اس کتاب کے بہترین ابواب ہیں۔

سعودی عرب پر ایک باب سے مصنف کی اس ملک کے سماجی اور سیاسی مسائل سے واقفیت کا اظہار ہوتا ہے۔ مصنف اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ سعودی عرب ''انقلاب کے لیے زرخیز زمین نہیں ہے'' (ص ۳۴۴)۔ اس کے باوجود کہ وہ جانتا ہے کہ سعودی باشندے اپنی حکومت کی پالیسیوں اور طرزِ حکمرانی سے مطمئن نہیں ہیں۔ سعودی پالیسیوں پر مصنف کی تنقید اور اس کی اپنی پالیسی تجاویز بہترین برطانوی استعماری روایات کے مطابق تحریر کی گئی ہیں۔

عرب اسرائیل امن کے عمل کے بارے میں جو باب لکھا گیا ہے اسے آسانی نظر انداز کیا جا سکتا ہے کیوں کہ اس باب میں ۱۹۹۳ء کے اوسلو معاہدے کے بعد رونما ہونے والے واقعات کا محض ایک خلاصہ دے دیا گیا ہے۔ جب کہ مسئلے پر دقت نظر سے روشنی نہیں ڈالی گئی۔

اپنی خامیوں اور کمزوریوں کے باوجود یہ کتاب عمدہ صحافیانہ رپورٹنگ کا نمونہ ہے۔ یہ کتاب عرب دنیا کے بارے میں تعارفی مطالعات کے لیے ایک انتہائی مفید کتاب ہے بشرط یہ کہ طالب علم مصنف کے تہذیبی تعصبات سے بچ کر اس کے معاشی اور سیاسی تجزیے پر توجہ مرکوز کر سکیں۔

[مامون فندی جارج ٹائون یونیورسٹی کے سنٹر فار کنٹمپریری عرب اسٹڈیز میں ریسرچ پروفیسر ہیں۔ مدیر]